پروفیسر حمید احمد خاں

اسلامی تہذیب[1]

تہذیب اور تمدن دو علیٰحدہ لفظ ہیں مگر عام گفتگو میں انھیں اس کثرت سے باہم ربط دیا گیا ہے کہ ان کے معنوی حدود خلط ملط ہو گئے ہیں۔ دونوں لفظوں کا لغوی مفہوم سب پر واضح ہے۔ تہذیب کے معنی ہیں چھانٹنا، تراشنا یا سنوارنا۔ اور تمدن سے مراد ہے (گاؤں سے نکل کر) شہر میں آباد ہونا۔[2] علمی سطح پر ان دو اصطلاحوں کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ تہذیب ذہن کے اخلاقی اور ذوقی قویٰ کی تربیت اور اصلاح و ترقی کا نام ہے۔ [اسی مفہوم کے پیشِ نظر جان رسکن کا قول ہے: "غلط قسم کی لذت کا ترک کرنا ایثارِ نفس نہیں، تہذیبِ نفس ہے۔"] اس کے مقابلے میں تمدن انسانی جماعتوں کی وہ حالت ہے جس میں انھیں سیاسی اور معاشرتی طور پر منظم ہو کر بہتر اور بلند تر زندگی بسر کرنے کا ایک عام اور مشترک شعور نصیب ہوتا ہے۔ یہ مشترک شعور آدابِ معاشرت اور علوم و فنون کے فروغ کا سبب بھی بنتا ہے اور نتیجہ بھی۔ یوں دیکھیے تو جہاں تہذیب ایک خاص قسم کی ذہنی کیفیت کا نام ہے وہاں تمدن سے مراد اس کیفیت کے وہ مادی آثار ہیں جن کا ظہور تہذیب کے تقاضوں کی روشنی میں ہوا ہو۔ اس طرح سمجھیے تو تمدن کے مظاہر لازماً خارجی دنیا میں موجود ہوتے ہیں۔ مسجد کے گنبد و مینار، نقاشی کے رنگ اور خطوط، غزل کا قافیہ اور ردیف، راگ کے سُر اور بول، یہ سب ایک خاص قومی تمدن کے عناصر ہیں۔ لیکن اس کے برعکس، جیسا میں نے ابھی کہا، تہذیب ایک ذہنی کیفیت، یا یوں کہیے کہ ذہنی کیفیتوں کا ایک مجموعہ ہے، جو خارجی دنیا میں بواسطۂ تمدن منعکس ہوتا ہے۔ ہماری یہ تعریف گو تہذیب و

---

[1] "تہذیب" کے بجائے ہماری زبان میں ایک اور لفظ "شائستگی" بھی مستعمل ہے۔ گزشتہ ربع صدی میں اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے لفظ "ثقافت" نے رواج پایا ہے لیکن کثرتِ استعمال اور عمر کی بزرگی "تہذیب" کو اوّلیت کا مرتبہ دیتی ہے۔

[2] تہذیب و تمدن کے مقابلے کے انگریزی لفظ کلچر اور سولائیزیشن بعینہٖ یہی لغوی مفہوم رکھتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ تہذیب کا تصور دیہاتی اور زرعی زندگی سے ماخوذ ہے اور تمدن کا شہری زندگی سے۔ درانحالیکہ دیہاتی ہونا ("گنوار پن") بعد میں غیر مہذب ہونے کی علامت قرار پایا اور تمدن کے دور کمال میں لوگ شہر سے صحرا کی تنہائی کی طرف فرار کو ترجیح دینے لگے۔

تمدن کے باہمی تعلق کو تسلیم کرتی ہے مگر ایک حقیقت کو دوسری کا بدل قرار نہیں دیتی۔ مثلاً یہی دیکھیے کہ مہذب شخص" کہنا صحیح ہے مگر "متمدن شخص" ایک بے معنی ترکیب ہے۔ کبھی کبھی "متمدن انسان" کی ترکیب استعمال کی جاتی ہے لیکن شخصی معنوں میں نہیں بلکہ جماعتی معنوں میں۔ "متمدن انسان" سے اشارہ کسی فرد واحد کی طرف نہیں ہوتا بلکہ اس سے تاریخ میں بنی نوع انسان کی وہ جماعتیں مراد ہوتی ہیں جو دورِ وحشت سے نکل کر دورِ تمدن میں داخل ہو گئی ہوں۔ اسی صورتِ حال کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ تہذیب اپنی نوعیت کے لحاظ سے انفرادی اور معاشرتی زندگی دونوں پر حاوی ہوتی ہے اور تمدن کی حیثیت بنیادی طور پر جماعتی ہے۔

میں نے یہاں تک جو کچھ کہا، اس کا ماحصل یہ ہے کہ تہذیب ایک خاص قسم کی ذہنی تربیت اور اس تربیت سے پیدا ہونے والا ملکہ ہے۔ ظاہر ہے کہ تہذیب کا عمل اپنے ظہور اور تکمیل کے لیے کسی نہ کسی ایسے نظریۂ زندگی کا متقاضی ہے جس کی روشنی میں اصلاح و ترقی کی منزلوں کا طے کرنا ممکن ہو۔ یہی نظریۂ زندگی بالآخر اپنی بنا کردہ تہذیب کا مزاج مقرر کر دیتا ہے۔ با ایں ہمہ، گو کسی قوم کے مذہب کو اُس قوم کی تہذیب سے گہرا علاقہ ہوتا ہے لیکن مذہب اور تہذیب محض ایک چیز کے دو نام نہیں ہیں۔ ذاتی طور پر میرے لیے کسی ایسی تہذیب کا تصور ممکن ہی نہیں ہے جو مذہبی اعتقادات کے کسی نہ کسی سلسلے پر مبنی نہ ہو۔ تاہم یہ بھی مسلّم ہے کہ محض اصولِ دین پر از روئے عقل و فہم حاوی ہونا، یا احکامِ شریعت پر خلوصِ نیت سے کاربند ہونا ہی کسی شخص کو مہذب انسان نہیں بنا دیتا۔ تہذیب کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب دینی نظریات کسی قوم یا علاقے کی معیشت کے سانچوں میں ڈھل کر مقامی اور عملی صورت اختیار کرتے ہیں۔ تہذیب کو چینی یا ہندی یا عربی یا ایرانی تہذیب کہے بغیر اسے صحیح طور پر متشخص کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تہذیب اس مرکب اندازِ فکر و عمل کا نام ہے جو کسی قوم کے مذہب، جغرافیے، تاریخ، فنونِ لطیفہ اور علم و حکمت، الغرض ایمان و اخلاق اور عقل و احساس کے تمام سرچشموں سے بہرہ یاب ہو۔

ترکیب و امتزاج کے اس عمل کے باوجود مذہب اور تہذیب کی جدا گانہ مگر متصل حیثیت اپنی اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ مذہب کے اصولی حقائق اٹل اور ہر حال میں قابلِ تسلیم ہیں۔ اس کے برعکس تہذیب کو لیجیے تو یہ کیا عقل، کیا جمالیات، کیا اخلاق، ہر پہلو سے تنقید کی زد میں آتی ہے۔ تہذیب میں زوال و فساد بھی ممکن ہے اس لیے اس میں اصلاح و تغیر کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ تہذیب کا خاکہ بڑی حد تک انسان کا

اپنا ساختہ پرداختہ ہے۔ اس خاکے کے نقوش ہر جماعت کے مخصوص مزاج، حالات اور عقائد کے مطابق قرنوں اور صدیوں میں بتدریج اُبھرتے ہیں۔ اس لحاظ سے قومی یا ملکی تہذیب فرد اور جماعت دونوں کی مشترک میراث ہے۔ اس کے سہارے فرد اور معاشرہ دونوں باہم ایک معتدل اور ربط اوقات خوش گوار رشتے میں منسلک رہتے ہیں۔ ایک طرف فرد زندگی سے حظ اٹھاتا ہے اور اس لطف اندوزی کی سند تہذیب کے اجتماعی ضابطے سے لیتا ہے۔ دوسری طرف معاشرہ مختلف افراد (اور بعض دفعہ مختلف المفاد افراد) کو متوازن حالت میں رکھ کر اجتماعی ترقی کی نئی راہیں کھولتا ہے۔ تہذیب کی دنیا میں حاکم اور محکوم، آقا اور خادم، بیوپاری اور گاہک، مدعی اور مدعا علیہ، ہر ایک کا تعلق ایک قسم کی باہمی رواداری کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔

اس مختصر مقالے میں ہمیں صرف اسلامی تہذیب کے صحیح مفہوم کی تشخیص سے سروکار ہے۔ اس تہذیب کے وہ مظاہر (مثلاً تعمیرات، خطاطی یا طب وہیئت) جنھوں نے مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کا تار و پود تیار کیا اور بالآخر مسلمانوں کا تمدن کہلائے، ان کی طرف یہاں صرف ضمنی اشارہ ممکن ہوگا، لیکن ان پر تفصیلی بحث کے لیے ایک الگ باب کھولنا ضروری ہے۔ اس وقت سوال صرف یہ ہے کہ اسلام نے انسانی شعور میں جو انقلاب برپا کیا، یا کرنا چاہا، اس کے بنیادی عناصر کیا ہیں؟

اسلامی تہذیب نے جن ذہنی کیفیتوں سے ترکیب پائی ہے، اُن میں سب سے پہلے اور سب سے اہم ہمارا دینی عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ بعض دوسرے مذہبی عقائد کی طرح پُراسرار، دھندلا اور خواب ناک نہیں ہے۔ یہ ہمارے صحنِ مسجد کی طرح کُھلا اور روشن ہے، بایں معنی کہ انسانی فطرت کے عقلی و جذباتی مطالبات سے ہم آہنگ ہے۔ اس عقیدے کا اصل اصول ایک ایسے دانا و بینا، قادرِ مطلق اور مسبّب الاسباب خدا کی وحدانیت پر ہمارا ایمان ہے جس کی قدرتِ کاملہ اور سنّتِ نافذہ تغیّرِ زمان و مکان سے متاثر نہیں ہوتی۔ یوں دیکھیے تو خدا کی وحدانیت کا مفہوم خدا کی یکتائی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اس کی مشیت روح و مادّہ دونوں کو حاوی ہے۔ اگر خدا ایک ہے تو اس کی پیدا کی ہوئی کائنات بھی ایک ہے۔ طبیعی قوانین ہمہ گیر اور یکساں ہیں، اور عقلِ انسانی کے لیے ان کا احاطہ کرنا ممکن بھی ہے اور واجب بھی۔ اسلام کے مابعد الطبیعی اور طبیعی نظریے میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ دین و دنیا میں جو قوانین جاری و ساری ہیں، ان کا سرچشمہ ایک ہے اس لیے ان کا عمل دین و دنیا میں متوازی چلتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ روحانی اور مادّی دنیا اس طرح الگ الگ نہیں ہیں کہ ہم ایک کو دوسری کا نقیض قرار دیں، جس طرح برہمنیت اور بدھ مت نے، اور ابتدائً صدہا سال تک خود مسیحیت نے کیا۔ اسلام دنیوی زندگی کا اثبات کرتا ہے، انکار نہیں کرتا۔ اسلام کے مثبت نظریۂ زندگی کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ مادّہ پرستی کے میکانکی نظریے کو ردّ کرتا ہے مگر ساتھ ہی ہمیں بتاتا ہے کہ عالم ارواح کے ساتھ عالم اجسام بھی خدا کی تسبیح و تقدیس میں مصروف ہے۔ گویا اسلام نے مادّے کا مقام اس طرح بلند کیا ہے کہ اسے روح کے برابر لا رکھا ہے جیسا وہ فی الحقیقت اور فی الواقع ہے۔ دین و دنیا ایک ہی وحدت کے دو رُخ ہیں، دو منفصل حقیقتیں نہیں ہیں۔ تاریخ اسلام میں مذہب اور سائنس کو کبھی وہ معرکہ درپیش نہیں ہوا جو اقوامِ مغرب کی تاریخ میں صدیوں تک برپا رہا۔ اسلام نے علم دین کے ساتھ علم دنیا کو بھی اہلِ ایمان کی دولت قرار دیا، اور یہ شعار روزِ اوّل سے ایسے محکم اور غیر مشتبہ انداز میں قائم ہو گیا کہ مسلمانوں نے روحانی اور مادّی زندگی کو الگ الگ خانوں میں کبھی بند نہیں کیا۔

یہ حقیقت بھی واضح رہنی چاہیے کہ توحید باری تعالیٰ محض اس فلسفیانہ مسئلے کا حل نہیں ہے کہ ظواہرِ کائنات کی کثرت کے پیچھے کوئی وحدت ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو اس وحدت کی ماہیت کیا ہے؟ سب کو معلوم ہے کہ مادّی کائنات کی وجودی وحدت کا سراغ بالآخر یونان و ہند اور مصر و روما کے فلسفے نے بھی پا لیا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے لیے عقیدۂ توحید کائنات کی وجودی وحدت کا اقرار ہی نہیں ہے۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ نفسِ انسانی خالق کائنات سے جو قادرِ مطلق اور مسبب الاسباب ہونے کے علاوہ سمیع و بصیر اور رحیم و کریم بھی ہے، براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔ ہر انسان کی آرزوئیں خدا کی رحمت کا سہارا ڈھونڈتی ہیں اور وہ عابن کر اس کی حضور تک رسائی پاتی ہیں۔ پرستش اور بندگی صرف ذات خدا کو سزاوار ہے۔ اس مد میں نہ انسانی عظمت آتی ہے، نہ فطرت کی قاہر مادّی قوتیں کسی شمار میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ توحید باری تعالیٰ پر ہمارا ایمان ہمیں نہ صرف خوفِ غیر اللہ سے آزاد کرتا ہے بلکہ ہمیں معاً ایک مستحکم اور خود دار شخصیت عطا کرتا ہے[۵]۔ اسلامی تہذیب دنیا کے مال و دولت کو اس کے صحیح مقام پر رکھتی ہے اور ہمیں حُبِّ جاہ کے مقابلے میں استغنا اور قناعت سکھاتی ہے۔

۵؎ یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات (اقبالؔ)

ایک خالق کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے بنی نوع انسان بھی ایک ہیں، اور ان کا باہمی تعلق مساوات اور اخوت کا ہے۔ اسلامی مساوات کی رو سے ایک عام بدوی اور جبلہ بادشاہ بنو غسان ہیں ایک سطح پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ "ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز" کی روایت اب بھی کسی نہ کسی حد تک برقرار ہے۔ مسلمانوں کے ایکے کی بنیاد اُن کا وطن نہیں بلکہ ان کا اسلامی عقیدہ ہے۔ سب انسانوں کے بھائی بھائی ہونے کے بارے میں ایک پاکستان ہی کو لے لیجیے۔ بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے قصبات تک، مسافر کی مدارات، خواہ وہ دنیا کے دوسرے سرے سے آیا ہو، اس طرح پر ہوتی ہے جیسے گھر کے سب سے معزز مہمان کی۔ نسل و رنگ کا امتیاز اسلامی معاشرے میں ناپید ہے۔ عجم پر عرب کی فضیلت یا شودر کے مقابلے میں برہمن کی برتری ہمیں تسلیم نہیں ہے۔ یہی صورت حال اصولاً پاکستان میں بھی قائم ہے اور اس ملک میں ہماری قومی تہذیب ذات پات کے تصور کا انکار کرتی ہے، گو ہندو تہذیب کے بعض آثار جو ہمیں ورثے میں ملے ہیں، اس بارۂ خاص میں کبھی کبھی ہمارے عمل اور ہمارے تہذیبی نصب العین کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں۔

راقم الحروف کو جمہوریہ ترکیہ میں جو اصطلاحی طور پر ایک "غیر دینی" (Secular) ملک ہے، ایک مرتبہ بڑا دلچسپ اور خوشگوار واقعہ پیش آیا۔ میرے سرکاری میزبان حکومتِ ترکیہ کی وزارتِ خارجہ کے ایک نوجوان افسر تھے، جن کی تعلیم انگلستان میں ہوئی تھی۔ وہ مجھے سرکاری موٹر کار میں انقرہ سے دس پندرہ میل باہر اتاترک کے ایک زرعی منصوبے کی سیر کے لیے لے گئے۔ ہمیں دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ پاس ہی ایک ریستوران میں کھانا کھانے والوں کے لیے درختوں کے سائے تلے میز کرسیاں لگی تھیں۔ اتفاق سے موسم بہار کا تھا اور درخت رنگ برنگ شگوفوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس صحیح تر کی فضا میں ہم اپنی موٹر سے اتر کر ایک میز کے سامنے بیٹھے ہی تھے کہ میرے ترک میزبان نے مجھ سے انگریزی میں کہا: "اگر ہمارا ڈرائیور بھی یہیں ہمارے ساتھ کھانے پر آ بیٹھے تو آپ کو اعتراض تو نہ ہو گا؟"۔ یہ سن کر میرا جی ایسا خوش ہوا کہ میں نے اپنے نوجوان ترک دوست کو برجستہ مبارک باد دی کہ اس نے اپنی دینداری کا نقارہ بجائے بغیر ایک ایسے شعار سے اپنی وابستگی کا ثبوت دیا جسے اسلامی تہذیب کا رکنِ رکین شمار کرنا چاہیے۔

اسی طرح کے بعض اور شعائر ہیں جو مسلمانوں کے ذاتی اور جماعتی احساس کا حصہ بن گئے ہیں۔ ہم بزرگوں کا ادب کرنے کو تہذیب کی علامت سمجھتے ہیں، گو اس خاص معاملے میں قدیم چینی تہذیب ہم سے شاید گوئے سبقت

سے گئی تھی۔ تاہم ہمارے نزدیک بھی صرف بڑی عمر کا لحاظ بالعموم ایک نیکی قرار پاتا ہے۔ عمر کی بزرگی کے اس لحاظ کے باوجود، ہم مالدار آدمی کو محض اس کی دولت کی بنا پر قابلِ تکریم قرار نہیں دیتے۔ اہلِ علم و فضل کو ہم خاص ادب و احترام کا مستحق سمجھتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں جنسِ اناث کا ایک علیحدہ معاشرتی مرتبہ ہے جس کے ماتحت غیر عورت بھی، اپنی عمر کے فرق کے مطابق، ہمارے لیے ماں یا بہن یا بیٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم اپنے ہمسائے کے رنج و راحت میں شریک ہونا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہماری گفتگو کا عام لہجہ بُردباری اور انکسار کا ہے، مگر ظلم یا زیادتی کے خلاف احتجاج کرنے سے ہم کبھی نہیں چوکتے[۴]۔ ان معاملات میں سے بعض کو دوسرے روحانی مذاہب نے بھی اپنے اخلاقی ضابطۂ حیات میں شامل کیا ہے، لیکن اسلامی تہذیب کی خاص فضیلت یہ ہے کہ اس نے خدا کے فرض اور دنیا کے فرض کی قدیم علیحدگی ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دی۔ محنت کر کے روزی کمانا، اپنے اہل و عیال سے اچھا سلوک کرنا، غور و فکر کی زندگی بسر کرنا، اور لکھنا پڑھنا، یہ سب کام ہمارے نزدیک باعثِ ثواب ہیں۔ اس قسم کے بیسیوں آداب و شعائر جن کی مکمل فہرست تیار کرنا یہاں مقصود نہیں ہے، یہ شہادت دیتے ہیں کہ اسلامی تہذیب دُنیوی زندگی کو صدقِ دل سے قبول کرتی ہے اور اسے دینی لحاظ سے بھی فضائلِ اخلاق کی تحصیل کا ذریعہ قرار دیتی ہے۔ اس لحاظ سے بدھ مت اور مسیحیت کے رہبانیت پسند نصب العین سے اسلام کے معاشرت شناس اور انسان دوست نظریے کا تقابل ایک خاص لطف رکھتا ہے۔ اسلامی تہذیب کی پوری تاریخ پاکیزگی اخلاق کی پیہم طلب کے ساتھ ساتھ عام مادّی زندگی کے کیف و سرور سے بہرہ اندوز ہونے کی داستان ہے۔ مسلمانوں کے باغ و راغ اور برج و حصار، رنگ برنگ نقش و نگار اور فوّارہ و آبشار و آبجو، سب پکار پکار کر اعلان کرتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری ہی سے مسلمان سرمایۂ دین و دنیا کو بلا تکلف ایک جگہ سمیٹنے لگے تھے۔ تین سو برس سے زیادہ ہوئے انگریز فاضل سر ٹامس براؤن نے اسلامی تہذیب کی اسی کیفیت کے پیشِ نظر اپنے خاص انداز میں ایک جگہ یہ کہا کہ "ترک[۵] جنھوں نے اپنی دنیوی زندگی گلستانوں میں بسر کی ہے عقبیٰ میں بھی گلستانوں کے

---

[۴] "تم میں سے جس کسی کو کہیں برائی نظر آئے، وہ اپنے ہاتھ سے اس کو بدل دے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو زبان سے کام لے، اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو دل میں برا گن رکھے۔ لیکن یہ (آخرالذکر عمل) ایمان کی ضعیف ترین شکل ہے۔" (حدیث نبوی)

[۵] دیکھیے کسریٰ کا باغ، از مصنفِ مذکور

طلب گار ہیں۔ جب تک زمین پر رہے، پھولوں سے لطف اٹھاتے رہے، اس لیے فردوسِ بریں میں بھی لالہ و گل کے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

مسیحی اقوام کی تہذیبی تاریخ تقریباً پندرہ سو برس تک اس معاملے میں ایک متضاد منظر پیش کرتی ہے۔ قرونِ وسطیٰ کی طویل صدیوں کے دوران میں مسیحی کلیسا نے مادّی کائنات کو من حیث المجموع ملعون و مردود قرار دے رکھا تھا۔ فتویٰ یہ تھا کہ ہبوطِ آدم نے دنیا کو "شیطان اور اس کے لشکرِ ارواحِ خبیثہ کی تحویل میں" دے دیا ہے۔ نتیجۃً مظاہرِ فطرت اور مظاہرِ فطرت سے ہر قسم کا ربط (مطالعے کے لیے ہو یا کسی اور غرض سے) قطعی طور پر حرام تھا۔ اس فلسفے کی رو سے انسان کا اخلاقی و دینی کمال ترکِ لذاتِ دنیوی کے سوا کچھ اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟ یہ مخصوص نظریۂ زندگی، جو ابلیسی اور رہبانی عناصر سے مرکب تھا، مسیحیت نے دوسری صدی میں اختیار کیا، اور اگلے دو سو برس میں اس نے مسیحی معاشرے میں اپنا مستقل مقام پیدا کر لیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہ فلسفہ بندکتینی (Benedictine) سلسلے کے رہبانی اصول و ضوابط کے ساتھ مغربی مسیحیت کے نظام میں داخل ہوا۔[۵] اس کے بعد تقریباً ہزار سال تک یورپ کی تہذیبی تاریخ رہبانی ضابطۂ حیات کی پابند رہی، تا آنکہ پندرھویں صدی میں، بڑی حد تک اسلام کے تہذیبی اثرات کے نفوذ نے، گردن بستہ انسان کو اس عذابِ الیم سے نجات دلائی۔

لیکن اسے تاریخ کی ستم ظریفی کہیے کہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ، جس نے خدا کی مادّی کائنات کے روشن دروازے پہلی مرتبہ مسیحی معاشرے پر کھول دیے، دین و دنیا کے درمیان وہ صحت مند اعتدال قائم نہ رکھ سکی جو اسلام کو روزِ اوّل ہی سے میسر ہو گیا تھا۔ نشأۃ الثانیہ کے بعد مغربی انسان نے ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف سفر کرنا شروع کیا، اور مادّے کے اثبات نے بتدریج یہ شدت اختیار کی کہ خدا کے انکار کی نوبت آ گئی۔ روح سے مادّے کی قدیم تفریق اب ایک نئی شکل میں نمودار ہوئی، یعنی گو پہلی صورتِ حال کالعدم قرار دے دی گئی مگر اب مادّے نے روح کی غیر فطری (اور غیر واقعی) اہمیت کی پر اس طرح اصرار کیا گیا جس کی مثال اس سے پہلے تاریخِ انسانی میں نہیں ملتی۔ جہاں پہلے دنیا پر نظر ڈالنا حرام تھا، وہاں محض دنیا اور محض دنیوی آسائش اب اس عدیم النظیر یکسوئی سے توجہ کا مرکز بن گئی کہ مطالعۂ عالمِ طبیعی اور تسخیر کائنات ہی مغربی معاشرے کا پہلا اور آخری

---

[۵] اس بحث کے لیے ملاحظہ ہو دائرۃ المعارف دینیات و اخلاقیات، جلد نہم، ص ۲۱۵

مقصد قرار پایا۔ نتیجہ (مجموعی دوسرے عوارض کے) یہ نکلا کہ کائنات کی تسخیر کرنے والے امتیازِ نسل و رنگ سے متعلق اپنے جاہلی تعصب کی تسخیر نہ کر سکے۔ اور پھر بین الاقوامی انصاف کا وہ تصور تو نہیں ایک بلند تر منزل کی بات ہے جسے قرآنِ مجید نے " ولا یجرمنکم شنآن قوم علی الا تعدلوا " کی بلیغ تنبیہ میں بیان کر دیا ہے۔ بہر حال اگرچہ مادی کائنات کے خوردبینی مطالعے نے سائنسی علوم کی ترقی کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا، مگر دین و دنیا کے منفصل ہو جانے سے جو عدم توازن پیدا ہوا اس نے انسان کے روحانی اطمینان و مسرت میں معتد بہ کمی کی اور قسم قسم کے ذہنی امراض کو فروغ دیا۔ نشأۃ الثانیہ کے انقلاب کو چار سو برس نہیں گزرے تھے کہ تاریخ کی مادہ پرستانہ تعبیر نے لاشیئیت (Nihilism) اور اشتمالیت (Communism) کے منکرانہ نظریے پیدا کیے، اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ مغربی دنیا ایک ہزار برس تک " نری روحانی " قسم کی یک طرفہ تہذیب کا معاشرہ رہنے کے بعد شاید اب " نری بدنی " قسم کی یک طرفہ تہذیب کا معاشرہ بننے کی طرف رخ کر رہی ہے ؎

ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے !

یہ مقالہ دراصل ضمنی طور پر بھی اقوامِ مغرب کی مسیحی تہذیب کے ماضی، حال اور مستقبل کا مطالعہ نہیں ہے۔ لیکن اس مختصر ذکر سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اسلامی تہذیب نے تاریخ میں پہلی مرتبہ دین و دنیا کے درمیان تعلق و تناسب کا جو رشتہ قائم کیا اس کا برقرار رکھنا بنی نوعِ انسان کی صحت و سلامتی کے لیے کیوں اور کس درجہ ضروری ہے۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اسلامی تہذیب نے قدیم تر تہذیبوں کے اجزا کو فراخ دلی سے جذب کیا اور جزوِ بدن بنایا، اور اس میں عرب و عجم، ہند و چین اور یونان و روما کے علوم و فنون کے لیے اپنا دامن وسیع رکھا۔ بایں ہمہ یہ حقیقت ہے کہ ماقبلِ اسلام کے معقولات سے استفادہ کرتے ہوئے اور ریاضی و ہیئت اور طبیعیات و کیمیا کے تجربات و نظریات پر انحصار کرتے ہوئے بھی اسلامی تہذیب و تمدن کا تعلق قرآن کے الہامی حقائق سے بدستور استوار رہا۔ اگر یہ صورتِ حال قائم نہ رہتی تو وہ تہذیب جس کے ہم وارث ہیں اسلامی تہذیب ہونے کے بجائے کچھ اور بن گئی ہوتی، بالکل اسی طرح جیسے دورِ حاضر میں مغربی تہذیب اپنے بعض نمایاں عناصرِ ترکیبی کے ہوتے ہوئے بھی مسیحی تہذیب کہلانے کی مستحق نہیں رہی۔

یہاں یہ سوال خود بخود پیدا ہو گا کہ کیا بحالاتِ موجودہ اسلامی تہذیب کے لیے اپنی مخصوص اقدار اور اپنی مخصوص شخصیت کو برقرار رکھنا ممکن ہے؟ بظاہر اس سوال کا جواب یہ ہو گا کہ اسلامی تہذیب کی اساس

قوانین فطرت کے واضح اثبات پر رکھی گئی ہے، لہٰذا قوانین فطرت کا وسیع تر یا عمیق تر استعمال اسلامی تہذیب کے لیے اساسی طور پر قوت کا باعث ہونا چاہیے، نہ کہ ضعف کا۔ دراصل مسلمانوں کو گیارہ بارہ سو برس کے وقفے سے ایک بار پھر وہی صورت پیش آئی ہے جس سے وہ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں دو چار تھے، اور جیسا میں نے ابھی کہا، بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ وہ موجودہ صورتِ حال سے تہذیبی طور پر اسی کامیابی سے عہدہ برآ نہ ہوں جس سے دمشق و بغداد میں ہوئے تھے۔ آٹھویں اور نویں صدی میں جس طرح ہم نے یونانی تہذیب کے قابلِ قبول عناصر کو جزوِ بدن بنایا، اسی طرح اب اقوامِ مغرب کی تہذیب کے قابلِ قبول عناصر کو جزوِ بدن بنانا ممکن ہونا چاہیے۔ موجودہ مغربی تہذیب اپنے بنیادی عدمِ توازن کی وجہ سے ایک غیر اسلامی تہذیب ہے۔ لیکن اسی طرح وہ یونانی تہذیب بھی غیر اسلامی تھی جس کے بعض عناصر کو بارہ سو سال پہلے جذب کرنے کے باوجود اسلامی تہذیب نے اپنی اصل صورت برقرار رکھی۔

یہ اصل صورت آٹھویں نویں صدی میں اور اس کے بعد اس لیے برقرار رہ سکی کہ مسلمانوں کا اپنا مستحکم اور خود مختار تمدن ان کی تہذیبی زندگی کو مستعد اور آمادۂ کار رکھنے کے لیے موجود تھا۔ جو نئے تہذیبی اثرات اس دور میں قابلِ قبول معلوم ہوئے، انھیں مسلمانوں نے فریقِ غالب کی حیثیت سے جذب کیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہر تہذیب کو اپنی بقا اور فروغ کے لیے خارجی دنیا میں لازماً ایک ایسا تمدن درکار ہوتا ہے جو اس کے اپنے مزاج کے مطابق ہو۔ موجودہ سائنسی اور مشینی دور میں اسلامی تہذیب کو اپنی بقا اور فروغ کے لیے ایک سازگار سائنسی اور مشینی تمدن کی ضرورت ہے جو انسان کی روحانی اور مادی زندگی کے درمیان بحالاتِ موجودہ بھی وہ توازن قائم رکھ سکے جس سے اقوامِ مغرب کا مادہ پرستانہ سائنسی اور مشینی تمدن بدیہی طور پر محروم ہے۔ یہ مغربی تمدن، یا کم از کم اس کا موجودہ غیر متناسب انداز، اسلام کے دینی و تہذیبی تصورات نے پیدا نہیں کیا۔ چنانچہ یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ اسلامی تہذیب کی بقا اور تقویت اسی ناسازگار تمدن کی فضا میں ممکن ہو گی۔

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک گزشتہ چند صدیوں میں سب سے بڑا حادثہ یہ پیش آیا کہ مغربی دنیا میں سیاسی، سائنسی اور عمرانی انقلابات کا ایک ایسا ناقابلِ تسخیر سلسلہ شروع ہوا جس کی ٹکر کے سامنے ہمارے اپنے تمدن کے قدم نہ ٹھیر سکے۔ اسلامی تہذیب کو زندگی کا سانس لینے کے لیے اٹھارھویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد، ایک نئے اسلامی تمدن کی ضرورت تھی جو ہماری قدیم تہذیبی روایت کو نئے سائنسی اور تکنیکی وسائل کے سہارے مضبوط بنیادوں پر قائم کر سکتا۔ یہ کارنامہ بوجوہ چند در چند ہم سے سر انجام

نہ پا سکا۔ یورپ کی نشأۃ الثانیہ کے دورِ آخر سے انیسویں صدی تک مسلمانوں نے یورپی علوم و فنون کے ظہور کو عالمگیر پیمانے پر جس طرح نظر انداز کیا، وہ ہماری تہذیبی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ یہ حقیقت دلیل و حجت کے بغیر ظاہر ہے کہ جس فضا میں اسلامی تہذیب کی زندگی اور کارفرمائی ممکن تھی، وہ اقوامِ مغرب کے نافذ کیے ہوئے امپیریل اور سرمایہ دارانہ (یا اشتمالی اور ملحدانہ) تمدن کی فضا یقیناً نہیں ہے۔ مشکل یہ آ پڑی ہے کہ یہی تمدن اپنی دوگانہ (اشتمالی اور سرمایہ دارانہ) حیثیت میں اس وقت دنیا کا غالب تمدن ہے۔ عالمِ اسلام کے تعلیم یافتہ طبقے کا ایک معتدبہ حصہ آج اسی تمدن سے مغلوب ہے۔ گو اس تمدن کو اسلامی تہذیبی تصورات سے براہِ راست کوئی ربط نہیں ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کا یہ قابلِ ذکر حصہ خواہ مغربی تمدن کے سرمایہ دارانہ رنگ سے متاثر ہو، خواہ اشتمالی رنگ سے، دونوں حیثیتوں سے عجیب مخمصے میں مبتلا ہے۔ اور اگرچہ یہ تمدنی گروہ دو متحارب فریقوں میں بٹا ہوا ہے لیکن قدرتاً ان دونوں فریقوں کو اسلام کے تہذیبی تقاضے جزئی یا کلی طور پر تکلیف دہ معلوم ہوتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اگر ہمارے قومی تمدن نے ہبوط و زوال کی زد میں آجانے سے پہلے جدید علوم و فنون کو بروقت جذب کر کے جزوِ بدن بنا لیا ہوتا تو ہم اس علمی و تہذیبی خلفشار میں مبتلا نہ ہوئے ہوتے جو دورِ حاضر میں ہمارے لیے زندگی کا عظیم ترین مسئلہ بن گیا ہے۔ ہمیں اپنے تہذیبی تقاضے اپنی روح کے تقاضوں کی طرح عزیز ہیں مگر ایک ناموافق تمدن کی کشش ہمیں سمتِ مخالف میں گھسیٹتی ہے۔ جس قدیم قومی تمدن کی ہوا میں ہماری تہذیب کا زندہ رہنا ممکن تھا اسے ہم نے اپنی کوتاہ بینی اور کوتاہ کاری کے ہاتھوں اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھا ہے اور جس زندہ اسلامی تمدن کو اس کی جگہ لینی چاہیے تھی، اس کی تخلیق ہم نے نہیں کی۔ لیکن اب بھی مایوس ہونے اور اپنی تہذیبی ہستی کو فنا کے سپرد کر دینے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ ہمیں لازم ہے کہ مغربی تمدن کی قاہرانہ قوتِ تسخیر سے مغلوب ہو جانے کے بجائے دانشمندی اور سلیقے سے سائنسی اور تکنیکی وسائل کی منصوبہ بندی کریں اور اپنے تمدنی ماحول کے ان عناصر کی تعمیر و استحکام میں لگ جائیں جو ہمارے دینی و تہذیبی مزاج سے موافقت رکھتے ہوں۔ اسلام کی مخصوص تہذیبی اقدار یعنی انسانی شخصیت کے مستقل وجود کا اقرار، مادی کائنات سے انسان کے عمیق روحانی رشتے کی تنظیمِ نو، معاشرے کی عادلانہ اور روادارانہ ترکیب، اور بین الاقوامی انسانی ضمیر کا اثبات، ابھی ایک نئے حیات افروز انقلاب کے لیے بیتاب ہیں۔ یہ زندہ قوتیں آج بھی مغربی دنیا کے پارہ پارہ ہوتے ہوئے تمدن کی ہلاکت کی منتظر ہیں اور ہمیں ایک صحت مند اور توانا اسلامی تمدن کے قیام کے لیے پیہم جد و جہد کرنے کی صلائے عام دیتی ہیں۔